مقالات

سُود میں نئے مباحث کا اضافہ

(مولانا سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

(۴)

اشتراکیت کا ردِّ عمل

روس میں اشتراکیت نے اپنا نظام قائم کرنے کے لئے جتنے بڑے پیمانے پر، جیسے سخت ہولناک ظلم کیئے، اور پھر اس انقلاب کی کامیابی نے دنیا کے ہر ملک میں طبقاتی جنگ کی سلگتی ہوئی آگ پر جو تیل چھڑکا، اس نے تمام غیر اشتراکی ممالک کے اہل فکر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ بے قید معیشت کے اصولوں اور طریقوں میں کیا ترمیم کریں جس سے محنت پیشہ طبقوں کی شکایات رفع ہوں اور ان کا ملک اشتراکی انقلاب کے خطرے میں پڑنے سے بچ جائے۔ اگرچہ بے قید معیشت کی برائیاں اسی وقت سے نمایاں ہونی شروع ہو گئی تھیں جب سے جدید سرمایہ داری کا نظام قائم ہوا۔ اس پر تنقید برابر ہوتی رہی۔ اس میں سطحی اور جزوی اصلاحات بھی کچھ نہ کچھ ہوتی رہیں۔ لیکن تغیر، ترمیم اور اصلاح کی ضرورت کا حقیقی احساس روسی اشتراکیت کے عمل، اثرات اور نتائج کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا، اور اس ردِّ عمل نے نظام سرمایہ داری کے دو بڑے بڑے علاقوں میں دو مختلف صورتیں اختیار کیں۔

جن قوموں کے نظام زندگی کو جنگ عظیم اوّل نے بری طرح درہم برہم کر دیا تھا، اور جنہیں اشتراکیت کی بھڑکائی ہوئی طبقاتی جنگ سے کامل تباہی کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اور جن کی سرزمین میں جمہوریت کی جڑیں کچھ مضبوط بھی نہ تھیں، ان کے ہاں فاشزم اور نازی ازم نے جنم لیا۔

جن قوموں میں جمہوریت مضبوط بنیادوں پر قائم تھی اور جن کے نظام زندگی میں جنگ نے کچھ بہت زیادہ خلل بھی نہیں ڈالا تھا انہوں نے اپنی پرانی وسیع المشرب جمہوری سرمایہ داری کو اسکی نظری بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے صرف اسکی "بے قیدی" میں ایسی اصلاحات کرنے کی کوشش کی جس سے اس کے نقصانات

دُور ہو جائیں۔

فاشزم اور نازی اشتراکی حضرات بالعموم اِن دونوں مسلکوں کو سرمایہ داری کی رجعت قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور الزام رکھتے ہیں کہ بورژوا سرمایہ داروں نے اپنی بازی ہرتی دیکھ کر ہٹلر اور مسولینی کو کھڑا کر دیا تھا۔ لیکن یہ اصل حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کسی طبقے یا کسی مخصوص مفاد کے بدنیت ایجنٹ نہیں تھے مارکس اور لینن ہی کی طرح کے لوگ تھے۔ ویسے ہی مخلص، ویسے ہی ذہین، اور ویسے ہی کج فہم۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف جنگ کی زبردست چوٹ نے ان کی قوم کو اس قدر بدحال کر دیا ہے کہ صدیوں کا قومی فخر و ناز خاک میں ملا جاتا ہے۔ دوسری طرف بے قید معیشت کی اندرونی خرابیاں اور اشتراکیت کی اوپری انگیخت قوم کے مختلف عناصر کو آپس ہی میں ایک سخت خونریز اور غارت گر کشمکش میں مبتلا کیے دے رہی ہیں۔ اس لئے انہوں نے ایسی تدبیریں سوچنی شروع کیں جن سے وہ طبقاتی اغراض کی اندرونی نزاع کو دور کر کے اپنی قومی وحدت کو پارہ پارہ ہونے سے بھی بچا لیں اور اپنی قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو مضبوط کر کے از سر نو اسکی عظمت کا سکہ بھی دنیا میں بٹھا دیں۔ لیکن وہ اور ان کے حامی اور پیرو، سب کے سب مغربی ذہن کی اُن ساری کمزوریوں کے وارث تھے جنہیں ہم تاریخ میں مسلسل کارفرما دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اپنے پیش رو مفکرین و مدبرین کی طرح انہوں نے بھی یہی کیا کہ چند صداقتوں کو لے کر ان کے اندر بہت سے مبالغے کی آمیزش کی، چند صداقتوں کو ساقط کر کے ان کی جگہ چند حماقتیں رکھ دیں، اور اس ترکیب سے ایک نیا غیر متوازن نظام زندگی لا کھڑا کیا۔

آیئے اب ذرا اس مرکب کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں کہ اس میں صحیح اور غلط کی آمیزش کس طرح کس تناسب سے تھی اور اس کے نفع و نقصان کی میزان کیا رہی۔ اگرچہ جنگِ عظیم دوم میں شکست کھا کر یہ دونوں تو اَم بھائی بظاہر مر چکے ہیں، لیکن ان کی پھیلائی ہوئی بہت سی بدعتیں بدلے ہوئے ناموں سے مختلف ملکوں میں اب بھی موجود ہیں اور خود ہمارا ملک بھی ان بلاؤں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس لئے فاشیت اور نازیت کے اجزاءِ صالح اور اجزاءِ فاسد کی نشان دہی اب بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جنگ سے پہلے تھی۔

صحیح اور مفید کام فاشی اور نازی حضرات اشتراکیوں کے اس خیال کو رد کر دینے میں بالکل حق بجانب تھے کہ ایک معاشرے اور ایک قوم کے زمیندار و سرمایہ دار طبقات اور محنت پیشہ طبقات کے درمیان صحیح اور فطری

تعلق صرف نفرت، عناد اور جنگ ہی کا تعلق ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ اصل چیز طبقہ نہیں بلکہ معاشرہ اور قوم ہے جس کے مختلف اجزا و اعضاء اپنے مجموعہ کے لئے مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان کے درمیان حقیقی تعلق، دشمنی اور جنگ اور پیکار کا نہیں بلکہ موافقت اور تعاون اور تعامل کا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ سب مل کر سب کے لئے اشیاء ضرورت پیدا کریں اور اجتماعی پیداوار کو بڑھا کر قومی دولت اور طاقت میں اضافہ کریں۔ اس موافقت اور تعاون میں اگر کوئی کمی یا خلل ہو تو اسے دور ہونا چاہیئے۔ نزاع و اختلاف ہو تو اسے رفع ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ بڑھے اور ایک ہی معاشرے کے اجزاء ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تل جائیں۔

انہوں نے اشتراکیت کے اس نظریہ کو بھی سختی سے رد کر دیا کہ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی ملکیت اور ذاتی نفع طلبی بجائے خود کوئی نقصان دہ چیز ہے جسے ختم ہو جانا چاہیئے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ یہ دونوں چیزیں خود اجتماعی مفاد ہی کے لئے مفید اور ضروری ہیں، بشرطیکہ یہ بے قید مشیت کی طرح غیر محدود نہ ہوں بلکہ کچھ حدود کے ساتھ محدود کر دی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ افراد کو اپنے نفع کے لئے جد و جہد کرنے کا حق تو ضرور ہے مگر اس حق کا استعمال اجتماعی مفاد کے تحت اور اس کے مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ اس کے خلاف۔ مرکزی مالیات High Finance، معدنیات، جہاز سازی و جہاز رانی، سامان جنگ کی صنعت اور ایسے ہی دوسرے بڑے کاروبار Big Business انفرادی ملکیت میں نہ رہنے چاہئیں۔ ایسے اجاروں کو بھی ختم ہونا چاہیئے جن میں اجتماعی مفاد کو شخصی مفاد پر قربان کیا گیا ہو۔ تجارت میں سے سٹے کو قطعی بند ہونا چاہیئے۔ قرض و استقراض کے نظام میں سے سود کو بالکل ساقط ہو جانا چاہیئے[1]۔ اور کاروبار کو ایسے قواعد و ضوابط کا پابند ہونا چاہیئے جو اس سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کے مفاد سے مطابقت رکھتے ہوں نہ کہ صرف ایک گروہ کے مفاد سے۔ اس کے بعد اگر ایک کارخانہ دار قیمتیں مناسب رکھتا ہے، مال اچھا تیار کرتا ہے، اپنے مزدوروں کو خوشحال اور خوشدل رکھتا ہے، اپنی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور اپنی ان خدمات کے معاوضے میں جائز حدود کے اندر رہ کر منافع لیتا ہے تو وہ آخر کس جرم کا مرتکب ہے کہ خواہ

[1] اگرچہ یہ لوگ سود کو عملاً بند نہ کر سکے، اور خود سٹیٹ نے قرض لے کر اس پر سود ادا کیا، لیکن نازی اور فاشسٹ، دونوں، سود کو برا جانتے تھے اور اسے بند کرنے کے قائل تھے۔

مخواہ اسے دشمن جماعت قرار دیا جائے ؟

انہوں نے پرانی وسیع المشربی کے اس نظریہ کو بھی بالکل یکا طور پر رد کر دیا کہ حکومت صرف پولیس اور عدالت کے فرائض انجام دے اور معاشی زندگی کے کاروبار سے کچھ غرض نہ رکھے۔ انہوں نے کہا کہ قومی معیشت کے مختلف عناصر کے درمیان ہم آہنگی اور توافق اور تعاون پیدا کرنا اور نزاع و کشمکش کے اسباب کو دور کرنا قومی ریاست کے فرائض میں سے ہے۔ انہوں نے ایک طرف ہڑتال کو اور دوسری طرف کارخانے بند کرنے کو از روئے قانون ممنوع ٹھہرایا۔ اجیروں اور مستاجروں کی مشترک کونسلیں بنائیں۔ ان کے درمیان حقوق و فرائض انصاف کے ساتھ مقرر کرنے کی کوشش کی۔ اور ان کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے باہمی گفت و شنید، پھر پنچایت اور بالآخر عدالتی فیصلہ کا ایک باقاعدہ نظام مقرر کر دیا۔

انہوں نے سرمایہ داری نظام کی اس خرابی کو دور کرنے کی بھی کوشش کی کہ جو لوگ بیکار ہوتے ہیں یا ناکارہ ہو جاتے ہیں ان کی خبر گیری کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اس طرح بے وسیلہ لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دینے کے جو نقصانات ہو سکتے ہیں نازیوں اور فاشیوں نے ان کو محسوس کیا اور بہت وسیع پیمانے پر سوشل انشورنس کا اہتمام کیا جس کے ذریعہ سے بیماری، بڑھاپے، بیکاری، اور حادثات کی صورت میں کارکنوں کو مدد دی جاتی تھی۔ نیز انہوں نے ماؤں اور بچوں کی نگہداشت، فلاح اطفال، یتیموں اور معذوروں کی خبر گیری، جنگ میں ناکارہ ہو جانے والوں کی امداد، لاوارث بوڑھوں کی دیکھ بھال اور ایسے ہی دوسرے امور خیریہ کے لئے عظیم الشان ادارے قائم کئے۔ جنگ سے پہلے جرمنی میں اس طرح کا جو ادارہ قائم تھا اس نے تقریباً ۵۰ لاکھ افراد کو سنبھال رکھا تھا۔

انہوں نے بے قید معیشت کے اس عیب کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ کی کہ سارا معاشی کاروبار بغیر کسی نقشے اور منصوبے اور ہم آہنگی کے چلتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے معاشی وسائل پوری طرح سے استعمال بھی نہیں ہوتے اور جتنے کچھ استعمال ہوتے ہیں ان میں توازن نہیں ہوتا۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے قومی معیشت کی رہنمائی اور تنظیم و توفیق Co-ordination م اسٹیٹ کے ہاتھ میں دیا، معاشی زندگی کے تمام شعبوں کی کونسلیں بنائیں، اور ایک منضبط اور منظم طریقے سے پیداوار کے وسائل اور قوتوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح انہوں نے بے روزگاری کا خاتمہ کر دیا[1]، پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ کیا، اور مختلف

[1] ۱۹۳۳ء میں جب نازی پارٹی برسر اقتدار آئی تھی تو جرمنی میں تقریباً ۸۰ لاکھ آدمی بیکار تھے۔ مگر چند سال بعد نوبت یہ آگئی کہ جرمنی کو کارکنوں کی کمی کا شکوہ تھا۔

شعبوں میں ہموار ترقی کی۔

حماقتیں اور نقصانات یہ تھیں فاشیت اور نازیت کی برکات۔ مگر ان برکات کے لئے اٹلی اور جرمنی کو قیمت کیا دینی پڑی؟

نازی اور فاشی حضرات نے طبقاتی منافرت کے افتراق انگیز اثرات کا مداوا قوم پرستی کی شراب سے، نسلی فخر و غرور کے جنون سے، دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور غیظ و غضب کے اشتعال سے، اور عالمگیری و جہاں کشائی کے جذبات سے کیا جس کا انجام کبھی کسی قوم کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوا ہے۔ قوموں کا صحیح نشوونما اور اٹھان اگر ہو سکتا ہے تو صرف تعمیری اخلاقیات اور ایک صالح نصب العین ہی کے بل پر ہو سکتا ہے۔ جو لیڈر اس طریقہ کو چھوڑ کر قومیت کے استحکام و ترقی کے لئے نفرت اور خطرے اور اشتعال ہی کو مستقل وسائل کے طور پر استعمال کرنے لگتے ہیں وہ اپنی قوم کا مزاج بگاڑ دیتے ہیں اور ایسے ذرائع سے اٹھی ہوئی قوم ایک نہ ایک دن بری طرح ٹھوکر کھا کر گرتی ہے۔

انہوں نے اپنی قوم کی بھلائی کے لئے معاشی و تمدنی اصلاح کا جو پروگرام بنایا اسکو سیدھے سیدھے معقول طریقے سے نافذ کرنے کے بجائے ایک نہایت لغو اجتماعی و سیاسی فلسفہ گھڑا جو بے شمار مبالغہ آفرینیوں اور عملی حماقتوں کا مرکب تھا۔ انہوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ "فرد قائم رابطِ ملت سے ہے ورنہ کچھ نہیں"۔ پھر اس پر یہ ردّا چڑھایا کہ رابطِ ملت میں جو فرد شامل نہیں ہوتا یا اس ربط کے قیام میں مانع ہوتا ہے اسے واقعی کچھ نہ رہنا چاہیئے۔ اس کے بعد استدلال کی عمارت یوں کھڑی کی کہ رابطِ ملت کا اصل مظہر ہے قومی ریاست، اور قومی ریاست کے ضبط و استحکام کا انحصار ہے اُس پارٹی پر جو قومی وحدت اور ترقی کا یہ پروگرام لے کر اٹھی ہے، لہٰذا "جرمن ہے تو نازی پارٹی میں آ" اور "اٹالین ہے تو فاشسٹ ہو جا"۔ اس طرح قوم اور ریاست اور حکومت اور حکمراں پارٹی کو ایک ہی چیز بنا ڈالا گیا۔ ہر اس شخص کو قوم اور قومی ریاست کا دشمن قرار دیا گیا جس نے برسر اقتدار پارٹی سے کسی معاملہ میں اختلاف کی جرأت کی۔ تنقید اور بحث اور آزادی رائے کو ایک خطرناک چیز بنا دیا گیا۔ ایک پارٹی کے سوا ملک میں کوئی دوسری پارٹی زندہ نہ رہنے دی گئی۔ انتخابات محض ایک کھیل بن کر رہ گئے۔ قوم کے دماغ پر ہر طرف سے مکمل احاطہ کرنے کے لئے پریس، ریڈیو، درس گاہ، آرٹ

لٹریچر اور تھیٹر کو بالکل حکمراں پارٹی کے قبضہ میں لے لیا گیا۔ تاکہ قوم کے کانوں میں اسکی آواز کے سوا کسی طرف سے کوئی دوسری آواز پہنچنے ہی نہ پائے۔ یہی نہیں بلکہ ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ اول تو غالب پارٹی کی رائے کے سوا کوئی رائے دماغوں میں پیدا ہی نہ ہو، اور اگر کچھ نالائق دماغ ایسے نکل آئیں جو خداوندانِ ملت کے خیالات سے مختلف خیالات رکھتے ہوں تو یا تو ان کے خیالات ان کے دماغ ہی میں دفن ہیں یا پھر ان کے دماغ زمین میں دفن ہو جائیں۔

انہوں نے بظاہر یہ بڑا ہی معقول سا نظریہ اختیار کیا کہ اجتماعی زندگی میں کوئی مرکزی منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے انتشار، بدنظمی، اور باہمی کشمکش بھی پیدا ہوتی ہے اور مجموعی طور پر طاقت اور ذرائع کا ضیاع بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے، لہٰذا پوری قومی زندگی کو منظم ہونا چاہیئے اور ایک مرکزی حکم کے تحت، ایک مرکزی طاقت کے مقرر کئے ہوئے نقشے پر تمام افراد کو بالکل ایک مشین کے پرزوں کی طرح باقاعدہ کام کرنا چاہیئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ پیداوار، اور ترقی اور خوشحالی کو تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھانے کی یہی ایک صورت ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے مطابق انہوں نے سارے ملک کی زندگی کو اس کے تمام معاشی، تمدنی، مذہبی، تہذیبی اور سیاسی پہلوؤں سمیت ایک ضابطے میں کس ڈالا اور ایک بندھے منصوبے پر چلانا شروع کر دیا۔ اُن کے نظام زندگی میں سب کچھ مقرر تھا۔ ہر شخص اور ہر ادارے کا کام مقرر۔ اجرتیں مقرر، قیمتیں مقرر، حقوق اور فرائض مقرر۔ قوتوں اور قابلیتوں کے استعمال کی صورتیں مقرر، سرمائے اور وسائل و ذرائع کے مصرف مقرر۔ حتیٰ کہ فکر و خیال اور جذبات و رجحانات کی راہیں تک مقرر۔ اور ان سب کے لئے کئی کئی سال کے پروگرام مقرر۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے محض قوم کی خاطر اتنی تکلیفیں اٹھا کر اور اتنی مغز زنی کر کے پوری قومی زندگی کی اتنے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی ہو، وہ بھلا کیسے برداشت کر لیتے کہ ایک شخص اٹھے اور ان پر تنقید کر کے دماغوں میں انتشار پھیلائے، جن کارکنوں کو کام میں منہمک ہونا چاہیئے انہیں بحث میں الجھا دے، اور اتنی محنت سے بنائے ہوئے منصوبے پر سے عوام الناس کا اطمینان اور اعتماد ختم کر دے۔ پس یہ "منصوبہ بند" زندگی کی اندرونی منطق ہی کا تقاضا تھا جس کی بنا پر وہ تنقید اور رائے زنی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ جس کو بولنا ہو وہ ہمارے پروگرام کی موافقت میں

بولے ورنہ اپنا منہ بند رکھے۔ منصوبہ بندی ہوگی تو زبان بندی اور خیال بندی بھی ضرور ہوگی۔ اختلاف رائے بند، بحث بند، تنقید بند، مواخذہ اور احتساب بند، بلکہ چند خاص دماغوں کے سوا ساری قوم کے دماغوں کا سوچنا بھی بند۔

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ نازی اور فاشی مسلک جو کچھ دیتے ہیں کیا وہ اس قیمت پر لینے کے قابل ہے؟ ساری قوم میں چند انسان تو ہوں انسان، اور باقی سب بن کر رہیں مویشی، بلکہ ایک مشین کے بیجان پرزے۔ اس قیمت پر یہ اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ سب کو چارہ برابر ملتا رہے گا!

نظام سرمایہ داری کی اندرونی اصلاحات اب ہمیں ایک نظر یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ جن ممالک میں وسیع المشرب جمہوریت کی جڑیں مضبوط تھیں انہوں نے نظام سرمایہ داری کو اسکی اصل بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے اس کے اندر کس قسم کی اصلاحات کیں اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، اٹھارویں صدی میں بورژوا طبقہ ایک طرف اپنے معاشی مفاد کے لیے بے قید معیشت کے اصول پیش کر رہا تھا اور دوسری طرف یہی طبقہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے جمہوریت، مساوات، اور حاکمیتِ عوام کا صور پھونک رہا تھا، آزادی رائے، آزادی ضمیر، آزادی تحریر و تقریر اور آزادی اجتماع کے حقوق کا مطالبہ کر رہا تھا، حتیٰ کہ اس بات پر بھی زور دے رہا تھا کہ ناقابلِ برداشت جبر کے مقابلہ میں رعایا کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا حق ہے۔ ابتدا میں جب یہ لوگ ان نظریات کو پیش کر رہے تھے تو ان کے پیش نظر شاہی خاندان، مالکِ زمین طبقے اور ارباب کلیسا تھے۔ سامنے وہ اُن کو دیکھتے تھے اور مقابل میں صرف اپنے آپ کو پاتے تھے۔ اس لئے ان کو بالکل یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ایک طرف جس بے قید انفرادیت پر معاشی نظام کی بنیادیں اٹھا رہے ہیں اور دوسری طرف سیاسی نظام کی عمارت جس جمہوریت اور تمدنی مساوات پر تعمیر کر رہے ہیں، یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کی ضد ثابت ہوں گی اور آپس میں ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں گی۔

جب ان کی جدوجہد سے نئے جمہوری نظام نے مختلف ممالک میں جنم لینا شروع کیا اور ووٹ کا حق مالکانِ زمین سے گزر کر تاجروں، کارخانہ داروں اور ساہوکاروں تک وسیع ہوا تو پھر یہ ممکن نہ رہا کہ کسی دلیل

سے اسکو مزدوروں اور کاشتکاروں اور محنت پیشہ عوام تک پہنچنے سے روکا جا سکے۔ بورژوا حضرات نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ان کی اپنی ہی منطق ان کے خلاف کام کرنے لگی، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ان کو اسی طرح عوام کا حق رائے دہی تسلیم کرنا پڑا جس طرح پہلے مالکان زمین کو خود ان کا حق ماننا پڑا تھا۔ پھر کسی دلیل سے یہ بات بھی معقول ثابت نہ کی جا سکتی تھی کہ مستاجروں کے لئے تو اپنی تنظیم جائز ہو اور اجیروں کے لئے جائز نہ ہو۔ یا مستاجر تو اپنی شرائط اپنی متحدہ طاقت سے اجیروں پر عائد کریں مگر اجیر اپنی جماعت کے زور سے اپنی شرائط منوانے کے مجاز نہ ہوں۔ اس طرح رفتہ رفتہ مزدوروں اور ملازموں کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنی انجمنیں بنائیں، اکیلے اکیلے نہیں بلکہ مجموعی طاقت سے اجرتوں اور تنخواہوں اور شرائط کار کے لئے سودا چکائیں، اپنی شکایات رفع کرانے کے لئے ہڑتال کا حربہ استعمال کریں، اور ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لئے پہرہ لگائیں۔

انیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ سیاست کا یہ پرانا نظریہ بھی ختم ہونے لگا کہ ریاست کا کام فقط شخصی آزادیوں کی حفاظت ہے اور قومی زندگی میں ریاست کے ایجابی فرائض کچھ بھی نہیں ہیں۔ اب اسکی جگہ یہ احساس خود بخود ابھرنا شروع ہوا کہ ایک جمہوری ریاست تو خود باشندگان ملک ہی کی متفقہ مرضی کی مظہر ہوتی ہے اور جمہور اپنی ہی سیاسی طاقت کو ریاست کی شکل میں مرتکز اور منظم کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ پرانی شاہی حکومتوں کی طرح اب جمہوری حکومت کے دائرۂ عمل کو بھی محدود دیکھنے پر اصرار کیا جائے۔ جمہوری حکومت کے فرائض محض سلبی نہ ہونے چاہئیں بلکہ اسے ایجابی طور پر اجتماعی مفاد کے لئے کام کرنا چاہیئے، اور اگر معاشرے میں بے انصافیاں پائی جاتی ہوں تو قانون سازی اور انتظامی مداخلت، دونوں کے ذریعہ سے اسکو اُن کا تدارک کرنا چاہیئے۔

حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ یکایک جنگ عظیم اوّل پیش آگئی، پھر روس میں وہ اشتراکی انقلاب برپا ہوا جس نے بورژوا طبقہ کے زن بچے تک کو لہو میں پیل دیا۔ پھر جرمنی اور اٹلی میں اس کا ردِّ عمل فاشیت اور نازیت کی شکل میں رونما ہوا جس نے بورژوا اور محنت پیشہ عوام، سب کو ایک سخت جابرانہ نظام میں کس دیا۔ ان واقعات نے سرمایہ داری کو اچھا خاصا "روشن خیال" بنا دیا اور وہ کچھ تو عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے دباؤ سے، اور کچھ خود اپنی مرضی سے پرانی بے قید معیشت کے نظام میں حسب ذیل تغیرات قبول کرتی چلی گئی:

۱۔ ہر شعبۂ معیشت میں مزدوروں اور ملازموں کی اجتماعی تنظیمات کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا ہے جو ان کی طرف سے بات

کرنے کی مجاز ہیں۔ اس کے ساتھ ایک حد تک رسمی یا قانونی طور پر بعض ایسی عملی تدبیروں کو بھی جائز و معقول مان لیا گیا ہے جنہیں مزدوروں اور ملازموں کی انجمنیں اپنے مطالبات منوانے اور ان کی خاطر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کر سکتی ہیں۔ اس طرح اگرچہ سرمایہ و محنت کی کشمکش ختم تو نہیں ہوئی، لیکن محنت اب سرمایہ کے مقابلہ میں اُتنی بے بس بھی نہیں رہی ہے جتنی بے قید معیشت کے دور میں تھی۔

۲۔ اجرتوں میں اضافہ، اوقاتِ کار میں کمی، کام کرنے کے حالات میں نرمی، عورتوں اور بچوں سے محنت لینے پر پابندی، مزدور کی جان اور صحت کی نسبتہً زیادہ پروا، اس کے گھر اور ماحول کو پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش، جسمانی نقصان پہنچ جانے کی صورت میں اس کی کچھ نہ کچھ تلافی، اور پھر سوشل انشورنس کی بھی بعض اسکیموں کی ترویج، یہ سب کچھ اگرچہ اُس حد تک نہیں ہوا جتنا ہونا چاہیئے تھا، لیکن بہرحال اب مزدوروں اور نچلے طبقے کے ملازموں کا حال اُتنا خراب بھی نہیں ہے جتنا پہلے تھا۔

۳۔ حکومت کی یہ حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ محنت اور سرمایہ کے درمیان حکم بنے۔ نیز ان کی باہمی کشمکش کو دور کرنے اور ان کے جھگڑے چکانے کی مختلف قانونی صورتیں بھی مقرر کر دی گئی ہیں۔ یہ چیز اگرچہ اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ ہر شعبۂ معیشت میں اجیر اور مستاجر کے درمیان حقوق و فرائض کا منصفانہ تعین کر دیا جائے، اور ابھی معاشی تنازعات میں عدالتی فیصلہ دینے کا کام بھی حکومت نے پوری طرح سے اپنے ہاتھ میں نہیں لیا ہے، لیکن اصولاً حکومت کا یہ منصب تسلیم کر لیا گیا ہے۔

۴۔ یہ اصول بھی مان لیا گیا ہے کہ انفرادی نفع اندوزی پر ایسی پابندیاں عائد ہونی چاہئیں جن سے وہ اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہونے پائے۔ اور یہ کہ ایسی پابندیاں عائد کرنا حکومت ہی کے فرائض میں سے ہے۔

۵۔ بعض ایسی معاشی خدمات کو حکومتوں نے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو یا تو انفرادی کاروبار کے بس کی نہیں ہیں، یا جنہیں افراد کے قبضہ میں دینا مجموعی مفاد کے خلاف ہے۔ مثلاً ڈاک اور تار اور وسائل حمل و نقل کا انتظام۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر اور ان کو درست حالت میں رکھنا۔ جنگلات کی پرداخت اور ان کا نظم و نسق۔ آب رسانی اور آب پاشی۔ برق آبی کی پیدائش اور تقسیم۔ روپے کا کنٹرول اس کے علاوہ اکثر حکومتوں نے معدنیات کو بھی اپنے اجارے میں لے لیا ہے اور بعض بڑی بڑی صنعتوں کو اپنے انتظام میں چلانا شروع

کر دیا ہے۔

۶۔ تھوڑی تھوڑی آمدنیاں رکھنے والے ملازموں اور مزدوروں کے لئے ایسے مواقع پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ وہ تھوڑا تھوڑا پس انداز کر کے تجارتی اور صنعتی کمپنیوں میں کم قیمت کے حصے خرید لیں۔ اور بعض جگہ ایسی صورتیں بھی اختیار کی گئی ہیں کہ خاص خاص قواعد کے مطابق ملازموں اور مزدوروں کی اجرتوں کا ایک حصہ ان کو نقد دیا جاتا ہے اور ایک حصہ ان کی طرف سے کمپنی کے سرمایہ میں شریک ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح بکثرت محنت پیشہ کارکن اُس کمپنی یا کارپوریشن کی ملکیت میں حصہ دار بھی ہو گئے ہیں جس کے اندر وہ مزدوری یا ملازمت کر رہے ہیں بعض بڑے بڑے مشہور کارخانوں میں ۸۰ فی صدی اور ۹۰ فی صدی مزدور اور ملازم شریک ملکیت ہو چکے ہیں اور اقساط پر حصے خریدنے کی آسانیاں حاصل ہونے کی وجہ سے کارخانوں میں ان کی حصہ داری کا تناسب برابر بڑھتا جا رہا ہے۔

وہ خرابیاں جو اب تک نظام سرمایہ داری میں باقی ہیں

لیکن ان تمام تغیرات، ترمیمات اور اصلاحات کے باوجود ابھی تک نظام سرمایہ داری کے بنیادی عیوب جوں کے توں باقی ہیں۔

ابھی تک بے روزگاری کا استیصال نہیں ہو سکا ہے۔ بلکہ زمانۂ جنگ کے سوا دوسرے تمام حالات میں یہ ایک مستقل مرض ہے جو نظام سرمایہ داری کے تحت سوسائٹی کو لگا رہتا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں جس کی صنعت و حرفت اور پیداوار و دولت آسمانِ عروج کو پہنچی ہوئی ہے، جنگی مشاغل کم ہوتے ہی ۳۲ لاکھ سے زیادہ آدمی بے کار ہو گئے۔ اپریل و مئی ۱۹۴۹ء کے درمیان ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۳۵ لاکھ سے اوپر ہو گئی، اور جون میں ۴۰ لاکھ تک جا پہنچی۔ تجارت و صنعت کی گرم بازاری کا زمانہ ہو یا سرد بازاری کا زمانہ، بے روزگاری کم و بیش ہر حال میں نظام سرمایہ داری کی جزو لاینفک بنی رہتی ہے۔

ابھی تک وہ عجیب و غریب معمّا جوں کا توں بے حل پڑا ہوا ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک طرف تو کروڑہا انسان ضروریات زندگی کے حاجت مند اور اسباب عیش کے خواہشمند موجود ہیں، بے حد و حساب قدرتی وسائل موجود ہیں جنہیں استعمال کر کے مزید اشیاء تیار کی جا سکتی ہیں، اور لاکھوں آدمی ایسے موجود ہیں جنہیں کام پر لگایا جا سکتا ہے، لیکن دوسری طرف نظام سرمایہ داری دنیا کی ضرورت اور امکانی کھپت سے بہت کم جو مال تیار کرتا ہے وہ بھی بازار میں پڑا رہ جاتا ہے کیونکہ لوگوں کے پاس اس کو خریدنے کے لئے روپیہ نہیں ہے،

اور جب تھوڑا مال ہی نہیں نکلتا تو مزید آدمیوں کو کام پر لگانے اور قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کی ہمت نہیں کی جا سکتی، اور جب آدمی کام پر ہی نہیں لگائے جاتے تو ان میں قوتِ خریداری پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

یہی نہیں بلکہ ابھی تک نظام سرمایہ داری کا یہ عیب بھی علیٰ حالہ قائم ہے کہ ہر سال بہت بڑی مقدار میں تیار کیا ہوا مال اور پیدا کیا ہوا غلہ اور پھل اور دوسرا سامان بازار میں لانے کے بجائے قصداً برباد کر دیا جاتا ہے، درانحالیکہ کروڑوں آدمی ان اشیاء کے طالب موجود ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار ان چیزوں کو غارت کر دینا اور اس غارت گری پر لاکھوں روپے صرف کر دینا زیادہ پسند کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ انہیں بازار میں لا کر ان کی قیمتیں گھٹائے اور انہیں سستے داموں حاجت مند انسانوں تک پہنچنے دے۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری کا یہ عیب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ ریاست، سوسائٹی، مالدار طبقہ، غرض کوئی بھی اپنے آپ کو اُن لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی کفالت اور دستگیری کا ذمہ دار نہیں سمجھتا جو قابلِ کار ہونے کے باوجود بے کار ہوں، یا ابھی قابلِ کار نہ ہوتے ہوں یا مستقل یا عارضی طور پر ناکارہ ہو گئے ہوں۔ اب بھی علاج کا مستحق وہی بیمار ہے جس کی جیب میں پیسہ ہو۔ اب بھی تعلیم و تربیت کا مستحق وہی یتیم ہے جس کا باپ انشورنس پالیسی چھوڑ مرا ہو۔ اب بھی حوادث میں گر کر وہی شخص اُٹھ سکتا ہے جو پہلے اچھے دن دیکھ چکا ہو اور اُن دنوں میں اس نے خود ہی بُرے وقت کے لئے سہارے کا سامان کر رکھا ہو۔ غرض ابھی تک مصیبت زدہ، حاجت مند، بے وسیلہ آدمی بجائے خود کسی کی بھی ذمہ داری نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ کہیں اتفاقاً کسی کو کچھ مدد مل جائے۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری کا یہ عیب بھی دور نہیں ہوا ہے کہ مصنوعی طور پر قیمتیں چڑھائی جاتی ہیں اور باقاعدہ منصوبے بنا بنا کر بعض اشیا کا قحط پیدا کیا جاتا ہے۔ غائب سودے اور تجارتی قماربازی کے مختلف طریقے اب بھی اجتماعی معیشت کے مزاج کو شب و روز درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو اب بھی کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ اگر وہ ایک بڑا سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں تو اپنے ذاتی نفع کے لئے جو مال چاہیں اور جتنا چاہیں تیار کریں اور معاشرے پر اُسکو ٹھونسنے کی جس طرح چاہیں کوشش کریں، خواہ معاشرے کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، بلکہ اُس کے لئے وہ چیز مضر ہی کیوں نہ ہو۔ اب بھی یہ عجیب صورتِ حال رات دن مشاہدے میں آرہی ہے کہ معاشرے کی نہایت اہم اور سخت ضرورتیں تو رُکی پڑی ہیں مگر محنت اور سرمایہ

عیش و عشرت کے سامانوں پر، شہواتِ نفس کے کھلونوں پر اور خوشحالی کے چونچلوں پر بے تحاشا صرف ہو رہا ہے۔ اب بھی صنعت اور تجارت کے بادشاہ اور مالیات کے شہنشاہ اپنی اغراض کے لئے وہ کھلی اور چھپی ریشہ دوانیاں کیئے جا رہے ہیں جو بین الاقوامی کشمکش، رقابت اور جنگ کی موجب ہوتی رہتی ہیں۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری میں معاشرے اور ریاست کی نکیل ساہوکار (بینکر) کے ہاتھ میں ہے اور وہ ساری اجتماعی قدروں کو شرح سود کے معیار پر جانچ رہا ہے اور اسی محور پر ان کو گھما رہا ہے۔ یہ فیصلہ وہ کرتا ہے کہ سرمایہ کو کن کاموں پر خرچ ہونا چاہیئے اور کن پر نہ ہونا چاہیئے۔ اور اس فیصلے کے لئے اس کے پاس معیار یہ نہیں ہے کہ معاشرے کے لئے ضروری اور مفید کون سے کام ہیں بلکہ یہ ہے کہ بازار کی شرح سود کے برابر یا اس سے زائد نفع کن کاموں میں ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے اگر آب رسانی کی بہ نسبت شراب رسانی زیادہ نفع آور ہو گی تو وہ بلا تامل عوام الناس کو صاف پانی کے لئے ترستا چھوڑ کر عیاشوں کو شراب پلانے کی فکر میں لگ جائیگا۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری کو وہ بیماری بھی لگی ہوئی ہے جسے کاروبار کا چکر" Trade Cycle کہتے ہیں، جس میں ہر چند سال کی گرم بازاری کے بعد دنیا کی معیشت پر کساد بازاری کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ کاروبار کی دنیا پوری تیز رفتاری کے ساتھ مزے سے چل رہی ہوتی ہے کہ یکایک تجار محسوس کرتے ہیں کہ جو مال ان کے گوداموں میں آ رہا ہے وہ مناسب رفتار سے نکل نہیں رہا۔ وہ ذرا فرمائشیں روکتے ہیں۔ صناع یہ حال دیکھکر ذرا مال کی تیاری سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ سرمایہ دار خطرے کی اس علامت کو بھانپتے ہی قرض سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور پہلے کا دیا ہوا بھی واپس مانگنے لگتا ہے۔ کارخانے بند ہونے شروع ہوتے ہیں۔ بے روزگاری بڑھتی ہے قیمتیں گرنی شروع ہوتی ہیں۔ تاجر اور گاہک مزید قیمتیں گرنے کی امید پر فرمائش اور خریداری سے ہاتھ روکتے ہیں۔ چلتے ہوئے کارخانے بھی پیداوار کم کر دیتے ہیں بے روزگاری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ حکومتیں آمدنی گھٹتی دیکھکر مصارف میں تخفیف کرنے لگتی ہیں۔ کساد بازاری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر قدم جو پیچھے ہٹتا ہے، کئی قدم اور پیچھے ہٹنے کا سبب بنتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب قطعی اور کلی دیوالہ کی سرحد قریب آ جاتی ہے تو یکایک رُخ بدلتا ہے، آہستہ آہستہ چڑھاؤ شروع ہو جاتا ہے، اور پھر گرم بازاری کا دور آ جاتا ہے۔ یہ چکر نظام سرمایہ داری کے لئے ایک مستقل مرض بن چکا ہے جس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت

نہیں ہوا۔

یہ اور دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے عیوب آج کی مقید اور اصلاح یافتہ سرمایہ داری میں بھی اسی طرح موجود ہیں جس طرح انیسویں صدی کی بے قید و بد اطوار سرمایہ داری میں پائے جاتے تھے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ جمہوریت نے اس نظام کے اصل اسبابِ خرابی کو سمجھ کر حکمت کے ساتھ انہیں دور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی ہے، بلکہ جو کچھ ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جتنا جتنا محنت پیشہ عوام کا دباؤ پڑتا گیا ہے، یا اشتراکیت کا خطرہ بڑھتا گیا ہے، بورژوا طبقے اپنے طریقوں میں ایسی ترمیمات کرتے چلے گئے ہیں جن سے عوام کی شکایات اس حد تک ہلکی پڑ جائیں کہ اشتراکی لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔